

اسلامی ریاست کی تشکیل اور علامہ اقبال کا نقطہ نظر

مارچ ۱۹۰۵ء کے ”محزن“ میں علامہ اقبال کی نظم ”نیا سوال“ شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

پس کچھ کہہ دوں اسے برہمن گر تو بڑا نہ مانے قیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا دھنچھوڑا، چھوٹے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھاتے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھو ہر ذرہ دیوتا ہے

یہ ایک طویل نظم ہے اور اس کا مرکزی خیال وطن کی مہربندی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے۔ شاعر کی خواہش ہے کہ وہ ایک ایسا سوال تیار کرے جس میں برہمن گلے میں نہ رانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں نیسبح بھی لیے ہوئے ہو، اور آواز اذان اور اقوس کی کے ہم آہنگ ہو کر توحید کے نغمے بکھیریں۔ اس سوال میں شاعر ایک سوال کی مودتی تخلیق کرنا چاہتا ہے جس کی صورت سندر، اور چھب موہنی ہو اور پھر:

”ہندوستان“ کا کہہ دیں ماتھے پہ اس صنم کے بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
یہ اس دور کی نظم ہے جسے عرفِ عام میں اقبال کا ”وطن پرستی“ کا دور کہا جاتا ہے شاعر جغرافیائی حدود کے حوالے سے اپنی شناخت کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اگر اس نظم اور اس دور کی دوسری نظموں مثلاً ہمالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، کو اقبال کے نظریہ وطنیت کی بنیاد بنالیا جائے تو یہ ہماری غلط فہمی ہوگی کیونکہ ایک تو شاعر کے ایک خاص دور کے خیالات کو اس کے عمومی خیالات قرار نہیں دیا جاسکتا، دوسرے خود ”ہنگامہ در“ ہی میں ہیں اس قسم کے اشعار بھی مل جاتے ہیں:

یہاں کہاں ہم نفس میسر ہے پس نا آشنا ہے یہاں وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زرخیز کن نہیں ہے

نرالا سا ہے جہاں سے اس کو عرب کے ہمارے چلایا بنا ہمارے حصاریت کی اتحاد وطن نہیں ہے
 کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے ہتیارِ حق بنو ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
 ان تازہ خراؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
 یہاں اقبال وطن کے اس تصور کو پیش کر رہے ہیں جس کی اساس نظریہ اسلامی ہے
 اور جس کے باشندے بقول اقبال :

باز تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویٰ ہے
 یعنی جغرافیائی حدود سے ماورا ہیں کیونکہ اسلامی نقطہ نظر، وطنیت کو جغرافیائی حدود سے
 محصم نہیں کرتا، وطن کی جغرافیائی حوالے سے تجسیم مغربی تصور ہے اور علامہ اقبال اپنی شاعری کے
 پہلے دور کی چند نظموں کے علاوہ اپنے کلام میں اور دوسری جگہوں پر اس تصور کو رد کرتے ہیں۔
 اپنے لیکچر ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ میں اقبال نے مغربی تصور وطنیت کے مقابلے میں اسلامی
 تصور کی وضاحت یوں کی ہے :

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور
 سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض
 اقتصادی، بلکہ لوگ اس برادری میں جو رسالتِ آیت نے قائم فرمائی ہے اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات
 کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ
 بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کا دار و مدار
 ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ شخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے رہنے کی
 قابلیت طبعاً موجود ہے، اسلام زبان و مکان کے قیود سے مبرا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کا تصور قوم تاریخی ہے نہ کہ جغرافیائی۔ ہماری نظریاتی بنیادیں
 وطنیت کے تصور کو استوار کرتی ہیں۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا مان کر ہم اپنے آپ کو جغرافیہ
 کی سلطنت میں محدود کر لیتے ہیں جبکہ تاریخ کی حدود بڑی وسعت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کے

تصور کو استوار کرتی ہیں۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا مان کر ہم اپنے آپ کو جغرافیہ کی سلطنت میں محدود کر لیتے ہیں جبکہ تاریخ کی حدود بڑی وسعت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کے نظریۂ ریاست کی تشکیل اسی حوالے سے ہوتی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وطن سے محبت نہ کی جائے۔ وطن کی محبت تو ایک فطری جذبہ ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے اور اس جذبے کو ہرگز رد نہیں کرتا، البتہ وطن کو اگر ایک سیاسی تصور کے طور پر لیا جائے تو یہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہوگا۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نقطہ نظر کے جواب میں علامہ اقبال نے اس سلسلے میں یوں وضاحت کی ہے:

”ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کردہ ارض کے اس حصے میں بودو باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تاک اہل براہمندوستانی تھے، آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں ”حب الوطن من الایمان“ کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں، لیکن زمانہ حال کے سیاسی اثر پھر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہدایت اجتماعیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال جس قسم کی اسلامی ریاست کی تشکیل کے خواہاں تھے، پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے ”اسرارِ خودی“ کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں اس جانب یوں اشارہ کیا ہے:

”وہ ایک نئے حرم (کہ) کی تعمیر میں مصروف ہے اس نئی رستی سے مراد ایک عالمگیر مذہبی مثالی ریاست ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان نس و وطن کی قید سے بے نیاز ہو جائیں۔ وہ مقامیت و وطنیت و دولہ کا مخالف ہے۔ وہ جس ریاست کا خواب دیکھتا ہے، اس میں دین کی بادشاہت ہوگی۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ اپنی

اسی مثالی ریاست کی عملی تشکیل کی جانب قدم اٹھایا اور واضح طور پر اعلان کیا: ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے، مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے، جن کی نسل، زبان، مذہب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ خدا غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کئی واحد الجنس قوم نہیں، پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان کے اندسایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست، قائم کرنا پڑے گی۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد جو بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مملکت کی اساس نہ تو رنگ و نسل کے اشتراک کو قرار دیتے ہیں نہ مشترکہ زبان و قومیت کو بلکہ ان کے نزدیک مذہب، مملکت کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بنیاد کے طے ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ علامہ اقبال اس مملکت کی تشکیل کس ڈھانچے کے تحت کرنا چاہتے تھے۔ اس موضوع کو زیر بحث لانے سے پیشتر خطبہ المہ آباد کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

”میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بروقت امن و امان ہو جائے گا، اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس سے آزاد ہو کر اپنے حواسِ تمذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر مدلیں سے طاری ہے۔

اس اقتباس میں دو باتیں خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

۱۔ عربی شہنشاہیت اسلامی تمذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم کے لیے جمود کا باعث ہوئی اور اس نے مسلمانوں پر منفی اثرات مرتب کیے۔

۲۔ اسلام ایک تمدنی قوت ہے جس کی اساس قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے اصول ہیں۔
یہاں باسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال شہنشاہیت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں۔
لیکن جمہوریت سے مراد مغربی جمہوری نظام ہرگز نہیں ہے کیونکہ اس نظام پر تو علامہ صاحب
افصح طور پر تنقید کرتے ہیں:

ہے وہی ساز کمن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از لوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کہ ب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیم پرری (خضریہ)
متاع معنی بیگانہ ازدوں فطرتاں جوئی زد و راں شوخی طبعے سلیمانے نمی آید
گریز از طرزیہ جمہوری غلام پختہ کار شد کہ از مغز و صخرہ فکر انسانے نمی آید
مغربی جمہوری نظام بھی اقبال کے نزدیک ”ساز کمن“ یعنی شہنشاہیت ہی کی ایک ترقی یافتہ
نکل ہے۔ اقبال تو اس نظام حکومت کے قائل ہیں جس میں حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہے اور اقتدار
علی اس کی امانت ہے جو منتخب افراد کے ہاتھوں اسی کے دیے ہوئے نظام کو چلاتا ہے۔
یہ کہتے ہیں:

سرور ری زبیا حفظ اس ذات یہ ہوتا کو ہے حکمران ہے اک دہی باقی بتانِ آذری
اس بنیادی نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ اقبال جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں۔ اپنے
نصیحت میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

”جمہوری طرہ حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔“
اس کی مزید وضاحت انھوں نے اپنے مضمون ”اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین“
میں لکھی ہے:

ہم جانتے ہیں کہ اسلام محض ایک مجموعہ عقائد نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ یہ
ایک امت ہے، ایک قوم ہے، امت کی حیثیت سے اسلام کی رکنیت کا تعلق نہ پیدائش سے ہے،
نہ مقامیت سے، نہ وطنیت سے بلکہ یہ رکنیت عبارت ہے عقائد کے اشتراک سے ایسی

امت کے لیے بہترین طریقہ حکومت جمہوریت ہی ہوگی جس کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ جہاں ممکن عملی طور پر ممکن ہو آزادی فراہم کر کے آدمی کو اپنی فطرت کے تمام ممکنات کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ اسلام کا اہم ترین پہلو بحیثیت ایک سیاسی نصب العین جمہوریت ہے۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ علامہ اقبال اصولی طور پر جمہوریت کے حامی ہیں لیکن مغرب میں اس نظام کی عملی صورت دیکھتے ہوئے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق جمہوریت کے لیے اخلاقی اور روحانی صفات سے متصف ہونا ضروری ہے کہ ان صفات کے بغیر وہ جمہوری قیام میں دلیو استبداد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس جمہوری مملکت کو علامہ جن اصولوں اور ضابطوں کے تحت چلانا چاہتے ہیں ان کا منبع و ماخذ یعنی سرچشمہ کیا ہے؟

علامہ اقبال کے کلام اور خطبات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہم آسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس اسلامی ریاست کے دستور و قوانین کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ ”رموز بے خودی“ میں ”در معنی اس کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئین ملت محمدیہ قرآن است“ کے زیر عنوان اقبال کہتے ہیں :

تو ہی دانی کہ آئین تو چیست ؟	زیر گردوں سر تمکین تو چیست
آں کتاب زندہ قرآن حکیم	حکمت اولایزال است و قدیم
نسخہ امرا و تکوین حیات	بے ثبات از قولش گیرد ثبات
مگر تو می خواہی مسلمان ز لیستن	نیست ممکن جز بقرآن ز لیستن

ان بنیادوں پر قائم ہونے والی مملکت اقبال کے نزدیک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قرار دی جاسکتی ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اقبال قرآن حکیم کے اس فیصلے کو کہ :

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ، قُلِ الْغَفْوہ

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے اپنی ضروریات سے جو کچھ زاد ہو۔

اس ریاست کی تشکیل میں ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قتلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار
علامہ اقبال حرف ”قل العفو“ میں پوشیدہ حقائق کی عملی صورت کو اس ریاست میں
رانج دیکھنا چاہتے ہیں یعنی وہ اسلامی عدل کے اصولوں کے مطابق ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا
چاہتے ہیں جس میں معاشی انصاف ہو اور جس کا تمدن سرمایہ دارانہ نظام سے آزاد ہو۔ کیونکہ یہ نظام
بقول اقبال:

تدبر کی جنوں کا دی سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
اقبال معاشرے میں محنت کو امتیاز کی بنیاد قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ عین اسلامی
ہے، اور معاشی انصاف کے لیے قرآنِ پاک میں واضح ہدایات و احکام موجود ہیں۔ ان احکام ہی
کے پیش نظر اقبال فرماتے ہیں:

کارخانے کا ہے مالک مردِ کب کے ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لیسَ للانسان الا ماسعی کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار
اس سلسلے میں علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس مسئلے کی پوری طرح
وضاحت کی تھی۔ اس خط کا یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے مگر فکرِ اقبال تک رسائی کے لیے اس کا
مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اقبال نے لکھا تھا:

”آپ کا خط موصول ہوا۔ اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی
ہوئی کہ مسلم لیگ کے پروگرام اور آئین میں تبدیلیوں کے بارے میں میں نے اپنے خط میں جو کچھ
لکھا تھا، اُسے آپ فراموش نہیں کریں گے۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آپ کو مسلم لیگ
کی نزاکت کا پوری طرح احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخر کار اس کا فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا یہ
صرف ایک ایسی جماعت رہے گی جو صرف مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی نمائندگی کرے یا وہ مسلمان
عوام کی نمائندہ تنظیم بنے گی جنہیں ابھی تک بعض ٹھوس وجوہ کی بنا پر لیگ سے کوئی ٹپسی نہیں رہی ہے
ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی مادی حالت سدھارنے کا وعدہ نہ
کرے وہ عوام کے لیے باعثِ کشش ہرگز نہیں ہو سکتی عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ

ان کے غریب و افلاس کا اصل باعث سود خور ہندو سامہوکار یا سرپاہ داری نظام ہے، تاہم ان میں انہی یہ شعور پیدا نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی اس بد حالی اور افلاس کی وجہ میں ایک ایسا دھرم ہو جس سے ان کے اندر اس احساس و شعور کا پیدا ہونا لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ مسلمان جو اہل لال نہرو کے بے دین سوشلزم کی طرف کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا حل کیا ہے اور اس مسئلے کو کیوں نہ حل کیا جاسکتا ہے؟ میرے نزدیک مسلم لیگ کے مستقبل کا انحصار لیگ کی طرف سے اس سوال کو سرگرمی کے ساتھ حل کرنے میں ہے۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں سے اس مسئلے کو حل کرنے کا وعدہ کرے تو میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پہلے کی طرح آئندہ بھی مسلمان مجرام، لیگ سے بے تعلق اور دُور ہی رہیں گے۔ مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس مسئلے کو اسلامی قوانین کے نفاذ نیز جدید نظریات و خیالات کی روشنی میں ان قوانین کو مزید بہتر بنا کر حل کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی قوانین کے طویل مطالعے اور اس بارے میں گہرے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانونی نظام کو مناسب طور پر سمجھا اور اس کا اطلاق کیا جائے تو اکثر کار کم از کم ہر شخص کے لیے لازمی ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے..... میرے نزدیک یہ امر واضح ہے کہ اگر ہندو مت سوشل ڈیموکریسی کو قبول کرتا ہے تو یہ یقینی طور پر ہندو مت نہیں رہے گا مگر اسلام کے لیے مناسب صورت اور اسلام کے قانونی اصولوں کی مطابقت میں سوشل ڈیموکریسی کا اختیار کرنا کوئی انقلاب نہ ہوگا بلکہ اسلام کے اصل اور پاکیزگی کی طرف مراجعت ہوگی چنانچہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے جدید مسائل کو حل کرنا زیادہ آسان ہوگا.....

اس خط کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال اس اسلامی ریاست میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں قائم ہوا تھا۔ جس میں دینے کی گلیوں سے سائل ناپید ہو چکے تھے، دینے والے ہاتھ لینے والے ہاتھوں سے زیادہ

تھے۔ یہ سب مغیر اسلام کی تعلیمات اور مساعیات محمدی کا اثر تھا۔ اقبال اس اعلیٰ اسلامی معاشرتی ڈھانچے کو عصر حاضر کے حالات اور تقاضوں کے مطابق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھی اقبال کا اجتہادی نقطہ نظر واضح طور پر چھلکتا ہے۔ اقبال فکر و عمل میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ اسی لیے اسلامی قوانین کو بنیاد بنا کر جدید دور کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں اور معروضی صورت حال کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اور ایک آخری بات یہ کہ علامہ اقبال تہذیبی و تمدنی حوالے کو بھی خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اسلامی ثقافت کے احکام کو اس اسلامی ریاست کا ایک اہم وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلام محض عقائد ہی کا مجموعہ نہیں ہے، زندگی کا مکمل لائحہ عمل بھی ہے۔ چنانچہ جہاں خطبہ الہ آباد میں علامہ نے اس جانب اشارہ کیا ہے، وہیں قائد اعظم کو ایک خط میں بھی لکھتے ہیں:

”یہ امر لا بدی ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف صاف بتادیا جائے کہ ہندوستان میں حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا مستقبل اگر معاشی مسئلے سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کس طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں ہے۔“

اس تمام بحث کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک وہ ریاست صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قرار دی جاسکتی ہے، جس میں معاشی انصاف ہو، اسلامی تہذیب و ثقافت کا احیاء ہو، جمہوریت اور آزادی ہو اور جس کا مرکز قوانین الہی (یعنی قرآن حکیم اور سنت رسول) ہو کہ مرکز کے بغیر قوانین زندہ نہیں رہ سکتیں، بقول اقبال:

قانون کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
موج صاحب مرکز تو خودی کیا ہے ؟ خدائی